R. No. 2186/57 [Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

جلد ۲۵ - شمارہ ۲	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۸ جنوری ۱۹۶۶ء

اداریہ

اُتر پردیش میں اُردو کے متعلق لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رائے

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی ساتویں رپورٹ شایع ہو گئی ہے اور اخبارو میں اس کی خاص خاص سفارشات شایع ہو چکی ہیں۔ اس وقت ہم اتر پردیش میں اردو کے متعلق اس رپورٹ سے کچھ ضروری مواد لے رہے ہیں تاکہ اتر پردیش کی حکومت کا اردو کے متعلق رویہ واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری نہیں کمشنر کی اس رویے کے متعلق کیا رائے ہے۔

پہلے ابتدائی تعلیم کو لیجیے۔ صفحہ ۱۴۵ پر تین سال کے اعداد اس طرح دیے گئے ہیں:

سال	اسکول	علیحدہ سیکشن	لسانی اقلیتوں کی زبان جس میں تعلیم ہوتی	تعداد طلبا کی	استادوں کی تعداد
۱۹۶۱-۶۲	۱۰۹۲	۲۵۴	اردو	۱۲۱۵۲۰	۳۹۶۲
۱۹۶۲-۶۳	۱۶۹۱	۴۷۷	"	۱۵۳۶۹۹	۳۴۶۰
۱۹۶۳-۶۴	۱۹۶۷	۱۹۳	"	۱۲۹۸۱۲	۳۰۹۲

اس کے مقابلے میں بہار میں ۱۹۶۱-۶۲ کے اعداد حسب ذیل تھے پچھلے دو سالوں کے اعداد ریاستی حکومت نے کمشنر کو مہیا نہیں کیے۔

۱۹۶۱-۶۲	۳۳۳۰	۱۵۷۷	اردو	۲۱۳۹۳۶	۵۵۸۷

اب ثانوی تعلیم کے اعداد ملاحظہ فرمائیے۔ یہ صفحہ ۱۹۶ پر دیے گئے ہیں:

سال	اسکولوں کی تعداد		علیحدہ کلاس یا سیکشن		طلبا بہ ذریعہ تعلیم	طلبا مضمون والے	استاد
	ذریعہ تعلیم	ایک مضمون	ذریعہ تعلیم	مضمون			
۱۹۶۱-۶۲	۲	۲۱۹	×	۱۷۷	۳۱۳	۲۱،۸۷۵	۳۹۰
۱۹۶۲-۶۳	×	۲۹۷	۱۸۳	۳۱۸		۲۶،۱۹۱	۴۹۹
۱۹۶۳-۶۴ (دوم مضمون کے اعداد)	×	۲۵۱	۱۶۲	۴۶۰		۲۳،۳۷۷	۴۱۵

اس کے مقابلے میں بہار میں ۱۲۲ اردو میڈیم اسکول ہیں ۷۰۰ ایسے اسکول ہیں جن میں اردو ایک مضمون ہے ۱۹۶۱-۶۲ میں ۲۶۷ طلبا میڈیم کے ذریعہ سے اور ۱۳۰۵۹ مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھتے ہیں اور استادوں کی تعداد ۱۲۲۸ ہے۔ پچھلے دو سالوں کے اعداد بہار کی حکومت نے مہیا نہیں کیے۔

ان اعداد سے یہ تو واضح ہو گیا ہوگا کہ بجائے کسی قسم کی ترقی کے ابتدائی اور ثانوی دونوں منزلوں پر تنزل ہوا ہے۔ اتر پردیش میں ایک بھی اسکول ایسا نہیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو اور بہار میں حالانکہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد اتر پردیش سے بہت کم ہے۔ نسبتاً حالت بہتر ہے گو وہاں بھی قابل اطمینان کسی طرح نہیں کہی جا سکتی۔ اگلی قسط میں ہم دوسرے امور کے متعلق اعداد و شمار پیش کریں گے لیکن اتر پردیش کی حکومت کا اردو کے سلسلے میں بے اعتنائی اور بے پروائی بلکہ افسوسناک غفلت کا رویہ ایسا ہے جس پر مرکز کو، اتر پردیش کے عوام کو، جمہوریت کے علمبرداروں کو اور قومی کارکنوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کوئی بھی شخص جس میں ذرا سا بھی انصاف کا احساس ہے اور جو تمام ہندوستانیوں کی ترقی کا دل سے خواہاں ہے اس صورت حال کو گوارا نہیں کر سکتا جو کرتا ہے

اس شمارے میں

اس میں اور سب کچھ ہو، ملک و قوم کی ترقی کا صحیح جذبہ نہیں ہے۔

(باقی)

آہ تلوک چند محروم

اخباروں میں کو جلد ہم تک اردو کے مشہور شاعر جناب تلوک چند محروم کے انتقال کی خبر ملی۔ چند روز پہلے وہ دل کا دورہ پڑنے سے بیمار ہو گئے تھے اور بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچا دیے گئے تھے۔ ان کے انتقال سے اردو کے دورِ بہار کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ محروم نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ بڑے لاجواب انسان تھے۔ ان کی وضعداری، ان کی محبت، ان کے اخلاق، ان کا بڑائی کے باوجود ہر شخص سے جھک کر ملنا کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہم سب ایک طور پر آپ کے کلام اور اس کی قدر دانی پر پلے ہیں۔ کئی نسلوں کے ادبی ذوق کی تربیت ان کے کلام سے ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کے کلام کا ایک حصہ بہت پہلے شائع ہوا تھا، مگر مختلف عنوانوں کے تحت کئی جلدوں میں ادھر ان کے لائق فرزند اور اردو کے ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد نے آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع کرا دیے تھے۔ قومی مسائل، مناظر فطرت، تغزل، بچوں کے لیے نظمیں، غرض جو بھی موضوع محروم کے قلم سے مس ہوا، فکر و فن کا ایک شاہکار بن گیا۔ پوری اردو دنیا آج محروم کے غم میں سوگوار ہے، جگن ناتھ آزاد کے غم میں شریک ہے اور موت سے کہہ رہی ہے:

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

سورج تنویر

دُور بین

سنا تھا کہ بعض اوقات زحمت سے رحمت کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ جارحیت کے بعد اس مقولہ کی صداقت پر یقین لانا ہی پڑا۔ پاکستانی حملہ کے زحمت ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن اس زحمت سے پیدا ہوئے رحمت کے بعض پہلوؤں پر شاید سب کی نظر نہ پڑ سکی ہو۔ مثلاً اس کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ خداوندانِ ریڈیو کے دل میں اچانک اردو پروری کا جذبہ جاگ اٹھا اور وہ اپنے پروگرام میں اس یتیم زبان کو بھی نوازنے لگے۔ اردو زبان کی خبروں کے بلیٹنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اردو شاعروں کو اپنی تخلیقات پیش کیے جانے کا موقع دیا جانے لگا نیز اردو کے چند نئے پروگرام جاری کر دیے گئے۔ گویا اس طرح پاکستانی حملہ کی برائی سے اردو کی بھلائی کا پہلو نکل آیا۔

پنجاب بھی پاکستانی حملہ کا شکار رہا۔ اس لیے جالندھر ریڈیو اردو نوازی میں دیگر مراکز سے آگے نہیں تو پیچھے بھی نہ رہا۔ چنانچہ اس ریڈیو اسٹیشن سے بھی جہاں "آتش گل" جیسے پروگرام کا اجرا ہوا۔ وہاں مغربی پنجاب کے سننے والوں کے لیے، جو پنجابی پروگرام "بزم عوام" کے عنوان سے شروع کیا گیا ہے اس کی زبان اردو نہ ہونے پر ایسی پنجابی نہیں جسے اہل پنجاب بھی نہ سمجھ سکیں۔ علاوہ ازیں چند ایسے پروگرام بھی نشر ہوتے رہتے ہیں جن کی زبان کا نمونہ کچھ اس طرح ہے

"____ آپ گلیں تو بہت مارتے ہیں۔ پر ان میں کم کی گل کوئی نہیں ہوتی ____"

پاکستانی جارحیت کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا اگر اس میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا نام نامی شامل نہ ہو۔ ایسی صورت میں ریڈیو والے اس نام کو کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے اور وہ بھی اردو پروگراموں میں۔ الغرض اس نام کو ایسے ایسے معنی پہنائے گئے کہ بڑے بڑے "لغویاتی" انگشت بدنداں رہ گئے ____ فرمایا گیا کہ یہ لفظ دراصل "زلف کار" ہے یعنی زلفیں بنانے والا۔ غالباً پاکستانی وزیر خارجہ کے اسلاف 'اصلاح گیسو' کا پیشہ فرمایا کرتے تھے۔ یا آپ بذات خود اس فن کے ماہر ہیں ____ اس پر اردو اخبارات کے صفحات میں ذوالفقار کے معنی پر ایک طویل بحث شروع ہو گئی اور لغت دانی کا بے تحاشہ مظاہرہ ہونے لگا۔

سلسلۂ بحث دلنظر میں حصہ لیتے ہوئے ایک گورداسپوری حکیم صاحب نے عربی دانی کا ادعا کر کے اس کا "ثبوت" مہیا کرنے کے لیے ذوالفقار کے لفظی معنی یوں بیان فرمائے ____ "یہ نام دو الفاظ کا مرکب ہے۔ "ذو" اور "فقار" ذو یا ذی کے معنی بڑا اعظیم۔ اور فقار جمع ہے فقیر کی۔ لہذا ذوالفقار کے معنی ہیں "بڑا فقیر" ____" تا حال یہ مفید بحث جاری ہے۔ اور اس لفظ کے معنی بیان کرنے کا سلسلۂ لا متناہی ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ بڑے بڑے نکتہ داں خامہ فرسائی میں مصروف ہیں

ط دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار

حافظ شیرازی پر کتاب کی اشاعت

تاشقند (تاس) چودھویں صدی کے شاعر اور فلسفی حافظ شیرازی پر ازبک عالم شاہ اسلام شاہ محمدوف کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے جو تاشقند یونیورسٹی کی مشرقی فیکلٹی کے ڈین ہیں حافظ کی تمام مشہور کتابوں کے مطالعے کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔ آپ نے حافظ ان مخطوطوں کا بھی جائزہ لیا ہے جو ازبک سائنس اکادمی کے محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔ ان کے نزدیک حافظ اپنے دور کے عظیم انسان پرست تھے، جنہوں نے علی شیر نوائی سمیت وسط ایشیا کے دوسرے ممتاز شاعروں کے عالمی نقطۂ نظر پر گراں بہا اثرات ڈالے ہیں۔

شاہ محمدوف اس سے پہلے عمر خیام، جامی اور سعدی پر کتابیں لکھ چکے ہیں، ان دنوں وہ فارسی ادب کی ایک ضخیم تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔

ہماری زبان سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیے

ڈاکٹر عبد الودود

ہمارے شعراء پر فرض ناشناسی کا الزام

اردو زبان و ادب پر متعصبانہ حملہ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے دور میں جب کہ یکجہتی کے جذبے کی شدید ضرورت ہے، متعصبانہ ذہنیت رکھنے والوں کے یہ حملے ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ ہم آنکھ اور کان بند کر کے اس منزل سے گزر سکتے ہیں لیکن کب تک۔ اس کے تدارک کی تدبیر سوچنی ہی ہوگی۔ یہ کام اتنا ہی ضروری ہے جتنا ملک میں اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کی کوشش۔

---

۲۴ اکتوبر کے دھرم یگ میں سردار جعفری کا ایک مضمون "ایوب شاہی کی چھایا میں پاکستانی بدھ جیوی" شایع ہوا۔ اس مضمون کا ترجمہ پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ سردار جعفری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض بہت ہی بد دل اور مایوس ہیں۔ "ایوب شاہی کے خلاف بغاوت کا جذبہ ان کے دل میں انگڑائیاں لینے لگا ہے۔" وہ رمز و اشاروں کا سہارا لے کر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب سے پاکستان کے نوعمر شاعر متاثر ہوئے ہیں۔ سردار جعفری نے جوش ملیح آبادی کو بھی ایوب خاں کی فوجی تاناشاہی کا سخت نقاد کہا ہے۔

انھوں نے پاکستانی فن کاروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک گروہ وہ ہے جو آنکھ بند کر کے ایوب شاہی کی حمایت کرتا ہے۔ "پاکستان کی ادبی دنیا میں یہ طبقہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ وہ بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔" دوسرے گروہ میں وہ ادیب اور شاعر ہیں جو "امن، جمہوریت اور آزادی کے حامی ہیں، جنھیں اپنے عوام سے محبت ہے اور اس لیے ایوب شاہی سے نفرت ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ وہاں کے اہلِ ذہن حضرات کا سب سے زیادہ اہم گروہ ہے۔ اور اس کی رہنمائی وہاں کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اور لینن امن انعام حاصل کرنے والے شاعر فیض احمد فیض کے ہاتھ میں ہے۔" تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں "جو ٹریڈ یونین تحریک سے متعلق ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں۔"

ہندی کے افسانہ نگار کملیشور نے ۲۱ نومبر کے دھرم یگ میں ایک مضمون "فیض شاہی کی چھایا میں کھالتی بدھ جیوی" شایع کرایا۔ وہ سردار جعفری سے متفق نہیں ہیں۔ انھوں نے فیض کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فیض ایوب شاہی کے ہم نوا ہیں۔ وہ طبقہ جس کی رہنمائی سردار جعفری نے فیض کو سونپی ہے تباہ و برباد ہو چکا ہے اور اپنے تاناشاہی حکمرانوں اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس سمجھوتے میں جوش بھی شامل ہیں کیونکہ انھیں پاکستانی حکمرانوں نے ہی دعوت دی تھی۔ سردار جعفری نے فیض کے اشعار پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ فیض پاکستانی حکمرانوں سے بیزار ہیں۔ کملیشور کا خیال ہے کہ وہی اشعار جو سردار جعفری نے ایوب خاں سے منسوب کیے ہیں وہ ہندوستان کی طرف بھی منسوب ہو سکتے ہیں۔ کملیشور نے پاکستان کے اخبار ڈان کے اقتباسات پیش کیے اور ان کی روشنی میں فیض کے اشعار نقل کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ در اصل وہ اشعار ہندوستان کے خلاف ہیں۔ انھوں نے فیض کی اس اپیل کا حوالہ دیا جو انھوں نے اپنے ہندوستانی ہم سفروں سے کی تھی اور جس میں انھوں نے کشمیر کے معاملے میں پاکستانی نقطۂ نظر کی حمایت کی تھی۔

---

۱۹ دسمبر کے دھرم یگ میں اردو کے افسانہ نگار رام لعل کا مضمون شایع ہوا۔ انھوں نے ایک دوسرے ہی زاویے سے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے "چھپا رہنے کی بھول"۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کے آپسی تعاون کا ذکر کیا اور بڑی حسرت سے اس دور کو یاد کیا ہے جب ہندوستان کے نقادوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کو پاکستان میں اور پاکستان کے اہلِ قلم کو ہندوستان میں شہرت ملی اور وہ مقام ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کا خیال ہے کہ فیض کے بارے میں کملیشور نے جو انکشافات کیے ہیں وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ رام لعل کا خیال ہے کہ ہم نے ایک بھول کی ہے اور وہ بھول یہ ہے کہ آج تک ادبی سطح پر سیاسی مسائل زیرِ بحث نہیں لائے گئے۔ وہ مسائل جو ہند و پاک کے درمیان اتحاد قائم کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

کملیشور اور رام لعل دونوں ہی مضمون نگاروں کے مضامین بہت ہی سوجھ بوجھ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ رام لعل کی وسیع النظری اور کملیشور کی بے باک تنقید، تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ سردار جعفری کے مضمون سے مجھے بھی اتفاق نہیں ہے۔ پھر بھی یہ کہوں گا کہ سردار جعفری نے جوش اور فیض کے دفاع کی کوشش نہیں کی ہے (جیسا کہ بعض لوگوں نے سوچا ہے) بلکہ ایسے ان کی ان دونوں شخصیات سے ضرورت سے زیادہ عقیدت مندی ہی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال جعفری کا مضمون ہو یا کملیشور کا دونوں ہی بحث و مباحثہ کا بہترین موضوع ہیں اور ہمیں ایک اہم مسئلے پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آپ کو لے آنا چاہوں گا۔ سردار جعفری اور کملیشور کے مضامین کے خاص پہلوؤں کا جس اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اس سے مضامین کی تفصیل ذہن میں آجاتی ہے۔ ایک طرف اس رسالے میں کملیشور اور رام لعل کے بہترین مضامین شائع ہوئے تو دوسری طرف بہت ہی گھٹیا قسم کا ایک مضمون اور کئی مکاتیب شائع ہوئے۔ ایسی تحریریں شائع کی گئیں جن کی ایک مشہور و معروف جریدے کے ادارے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ رسالے کا مطالعہ کرنے والوں پر ان کا جو اثر ہوا ہوگا وہ کسی طرح اچھا نہیں کہا جا سکتا۔ افسوس ان لوگوں پر ہوتا ہے جو بغیر سوچے سمجھے محض تعصب کی بنا پر کچھ بھی کہہ دیتے اور زہر اگل دینے کے عادی ہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ کملیشور کے مضمون کی اہمیت نہ سمجھی جا سکی اور ہندوستان کی اردو شاعری زد میں آگئی۔

۲۲ دسمبر کے دھرم یگ میں ایک مضمون نگار رام منوہر ترپاٹھی کا مضمون "فیض شاہی اور ایوب شاہی بنام بھارتی بدھ جیوی" شائع ہوا ہے۔ مضمون کے یہ جملے دیکھیے اور مضمون نگار کی ذہنیت، سوجھ بوجھ کی داد دیجیے:

"اردو شاعروں میں کیفی اعظمی کی آواز سب سے زیادہ تیز رہی ہے۔ انھوں نے دو ٹوک صاف صاف باتیں کہی ہیں اور بہت سے ہندی اور اردو شاعروں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ دوسرے بڑے شاعروں نے تہذیب کے جھاڑ فانوس لگا کر اپنے پیغام کو آراستہ کر کے ضرور دیا ہے مگر اسے مخاطبت کی آواز نہیں کہا جا سکتا قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ کم مشہور اور کئی چھوٹے اردو شاعروں نے تو للکارا ہے۔ کچھ زوردار کھلے الفاظ میں کہا بھی ہے۔ مگر بڑے ہندوستانی شاعروں نے بچ بچا کر کہا ہے جیسے لوگ کانپ رہے ہیں۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ مضمون نگار کے نزدیک صرف کیفی اعظمی اور چھوٹے شاعروں نے ہی پاکستان کو للکارا ہے دوسرے بڑے شاعروں کا انداز مخاطبت تیز نہیں ہے۔ انھوں نے مصلحتاً بچ بچا کر کہا ہے۔ افسوس اس ذہن پر ہوتا ہے جس نے ایسا سوچا۔ کیونکہ یہ خیال بالکل غلط ہے اور اردو کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے، لوگوں کو گمراہ کرنے کی دانستہ کوشش۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے مضمون نگار کی لاعلمی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو اس کا یہ فعل مجرمانہ ہی ہے۔ اس مضمون کے چند جملے اور دیکھیے۔

"ایسے کئی ہندوستانی شاعر بکری ہیں (جن سے قارئین واقف ہیں نام لکھ کر کچھ کہنا یا فہرست پیش کرنے کا مناسب موقع نہیں ہے) جنھوں نے اس حیثیت کے زمانے میں منہ نہیں کھولا۔ کچھ نے دو معنی باتیں کہی ہیں جن کا جب چاہے مطلب لگائیے۔ شاعر کا "دو منھا" فعل کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہندوستان کے کچھ شاعر پاکستان میں بھی بڑے محبوب شاعر ہیں، ان کی وہاں عزت ہے۔ وہاں اچھے سامعین کا طبقہ اور پڑھنے والوں کا طبقہ بھی ہے۔ ایک مشاعرے کے بیدار سامعین تو یہ طنز کر رہے تھے کہ بہت سے نام نہاد شاعر خاموشی کے ساتھ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اگر کبھی امن ہوا اور پاکستان میں انڈو پاک مشاعرہ ہوا تو سامعین کے بیچ ان کی کیا حالت ہوگی۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ ان کی تخلیقات وہاں ابھی پڑھی جا رہی ہیں۔ کچھ کھل کے کہہ دیا تو اس کا ردعمل وہاں کے پڑھنے والوں پر ہوگا۔ پڑھنے یا سننے والوں کی خاطر یہ جرم اپنے فرض سے انھیں بھٹکا رہی ہے۔ یہ بھٹکاؤ کتنے دن اور رہے گا اس کا فیصلہ تو جنگ کے موجودہ حالات کی وجہ سے کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔"

مضمون نگار کہنا یہ چاہتا ہے کہ اردو کے شاعر پاکستان میں شہرت کے محتاج ہیں۔ اس لیے بڑی الجھی الجھی باتیں کرتے ہیں۔ کہیں پاکستانی عوام ان کے جذبۂ حب الوطنی اور صداقت پسندی سے متنفر نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو بیچارے شاعر گمنام ہو کر رہ جائیں گے۔ اگر پاکستان میں ان کی قدر نہیں ہوئی تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔

ایسے لوگوں کو کون بتائے کہ ہندوستان کے شاعر پاکستان میں شہرت کے بھوکے نہیں ہیں۔ ان کے وطن کا ایک مخصوص طبقہ ان کی زبان و ادب کی اہمیت کا بظاہر اقرار نہ کرے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اردو زبان کی شیرینی نے سب کو رام کر رکھا ہے۔ ان کی زبان جس کی اپنی لسانی، تہذیبی و تمدنی تاریخ ہے کے وجود سے بھلے ہی انکار کیا جائے اور اسے متعصبانہ ذہنیت صرف مسلمانوں کی زبان کہے لیکن اہلِ نظر اس کی اہمیت اور ہندوستان گیر وسعت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں کون بتائے کہ دہلی، امرتسر اور چنڈی گڑھ کی ادبی محفلوں کی رونق وسیع النظر غیر مسلموں کی وجہ سے ہی ہے جن کی ادبی خدمات اردو کی بقا کی ضامن ہیں۔ یکجہتی کی شاندار روایات کے بھی معمار ہیں۔

اردو کا شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی شاعری کو ہی قبول عام نصیب ہوتا ہے، سنسکرت آمیز ہندی کو نہیں۔ وہ اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے حملہ کیا تو اس وقت اردو شعرا خاموش نہ رہ سکے۔

(باقی ...)

غزلیں

شاذ تمکنت

سخن راز نشاط و غم کا پردہ ہو ہی جاتا ہے
غزل کہہ لیں تو جی کا بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے
وہ عالم جب کسی مایوس کا ہوتا نہیں کوئی
مجھے معلوم بھی ہے تو کسی کا ہو ہی جاتا ہے
بھلا دیں دل سے یا دیں چار دن ہنس بول کر کاٹیں
کبھی اپنا بھی کچھ ایسا ارادہ ہو ہی جاتا ہے
بہ ایں ترک تعلق وعدہ و پیماں کے عنواں سے
تری آنکھوں کی جانب سے تقاضا ہو ہی جاتا ہے
کیا ہے میں نے اظہار تمنا جانے کس کس سے
مجھے اکثر تری صورت کا دھوکا ہو ہی جاتا ہے
ہجوم آرزو ہمراہ جان و دل سہی لیکن
قریب کوئے جاناں کوئی تنہا ہو ہی جاتا ہے
کوئی تجھ سا نہیں ہے انجمن در انجمن دیکھا
مگر تنہائیوں میں کوئی تجھ سا ہو ہی جاتا ہے
ہمیں تو عمر بھر کا غم کہ ایسا کیوں ہوا ہوگا
ہمیں اب کون سمجھائے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے
نہ رو لو بس ذرا آنکھیں جو دکھائیں دیکھتے جاؤ
نہ اتنا ظلم کرو یہ دل ہے صحرا ہو ہی جاتا ہے

کرشن موہن

اپنا دشمن ہے بڑا دہشت کوش
کہ ہے مانگے کے نشے سے مدہوش
ناز ہے اپنی ہی قوت پہ ہمیں
اس لیے ہم نہیں مرہونِ خروش
تیرا کردار زبوں ہے ظاہر
لاکھ ہو کوئی ترا پردہ پوش
پڑ گیا جوشِ جوانی ٹھنڈا
ہو گیا سوزِ محبت خاموش
زندگی نام ہے بیداری کا
ہوش کی موت ہے خوابِ خرگوش
رفعتِ فکر میں اپنا آدرش
آج ہے عرشِ بریں کا ہمدوش
دشمنِ دوں کو مٹانے کے لیے
کرشن موہن کا وطن ہے پرجوش

اردو کی ترقی کے لیے ٹھوس کام کرنے کی ضرورت ہے

تیج بہادر سنہا

۱۹۶۱ء میں یوپی کے وزیر اعلیٰ مسٹر سی۔ بی۔ گپتا نے اترپردیش کے کچھ اضلاع کو اردو کا مخصوص علاقہ قرار دیا تھا ان میں اضلاع روہیلکھنڈ میں سے بریلی رام پور مراد آباد اور بجنور شامل تھے۔ اس مرتبہ ضلع پیلی بھیت بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ اور اب بڑی حد تک اردو کو کل روہیلکھنڈ کے لیے صرف بدایوں اور شاہجہاں پور کے اضلاع چھوڑ کر علاقائی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بدایوں اور شاہجہاں پور اردو ادب اور اردو شاعری کے عظیم مرکز رہے ہیں جہاں تک شہری حلقوں کا تعلق ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لکھنؤ کی طرح ان دونوں اضلاع کے شہری حلقے فوری طور پر اس فہرست میں شامل کئے جانے کے مستحق ہیں۔ ان اضلاع میں جنہیں اردو کا علاقہ محدود طور پر تسلیم کیا گیا تھا دفتروں کی فہرستیں اردو میں شائع کردی گئی ہیں۔ ابھی حکومت اس سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہے لیکن ہمیں ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچنا ہے کہ کیا سارا کام اور تمام ذمہ داری حکومت کے سر پر تھوپ دینے سے ہی اردو کے کاز کو ہم آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے انہماک کے ساتھ ٹھوس کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس ٹھوس کام کیلیے ہمیں اپنے ذرائع اور وسائل پر نگاہ ڈالنی ہوگی ہر بات کے لیے ایجی ٹیشن کرنا اور حکومت کے روبرو مطالبات رکھنا نہ تو اچھی سیاست ہے اور نہ اچھی کوشش

مجھے معلوم ہے کہ ابھی تک اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے لیکن ہمارے درمیان خوش قسمتی سے اضلاع روہیلکھنڈ میں ہزاروں اردو داں افراد موجود ہیں جو اپنے حلقوں میں نئی نسلوں کو اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کا کام فرصت کے اوقات میں اپنے ذمے لے سکتے ہیں۔ اگر نئی نسلیں اردو حرف شناسی سے محروم رہ گئیں تو اردو کے لیے ساری مہم بے کار ہو جائے گی اس سلسلے میں بڑی خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ اردو کی گھریلو تعلیم کے لیے اچھی ریڈریں اب بازار میں آگئی ہیں۔ کچھ حیدرآبادی پبلشروں نے ان کے بڑے مستند اور ستھرے ایڈیشن شائع کیے ہیں جن سے بڑی حد تک کام چل سکتا ہے۔ آگے چل کر ہم انجمن ترقی اردو کو بھی مجبور کر سکتے ہیں کہ ان ریڈروں کے پاکیزہ اور بہتر ایڈیشن شائع کرنے کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیکن اس سے قبل ہمیں ان کے لیے بازار میں مانگ پیدا کرنی ہوگی۔

جو افراد گروہ بندی کو ہوا دیتے ہیں انہیں بے نقاب کیا جائے اور اردو کا دوست تصور کرنے کی جگہ انہیں اردو کا دشمن سمجھ لینا ہی بہتر ہوگا خصوصیت کے ساتھ وہ افراد تو ہر اعتبار سے قابل مذمت ہیں جو اردو کے کسی کام میں فرقہ پرستی پیدا کرتے ہیں۔ یہ فرقہ پرستی آج بھی بڑی شدت کے ساتھ ابھر رہی ہے میں خود اس فرقہ پرستی کا شکار رہا ہوں اخبار کی کتابت کا بائی کاٹ اسی فرقہ وارانہ تحریک کا ایک جز ہے جبکہ نہ تو مجھے دشمن اسلام قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ دشمن اردو۔ اس وقت میں یہ ساری داستان دہرانے اور اس کی تفصیلات میں جانے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ مجھ پر اور میرے اٹھائے ہوئے کاموں پر اس تمام تحریک کا کوئی اثر نہ پڑ سکا کیونکہ خدا کی مدد شامل حال رہی ہے۔

چین کے رہنماؤں نے ہندوستان کے امن پسند عوام کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ ہندوستان کے اردو شعرا بھی متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کا تحفہ عوام کو پیش کیا۔ یہ تحفہ قومی ادبی سرمایے کا ایک بڑا ہی قیمتی جزء ہے۔ ان کی آواز ہندوستان کے کوچے کوچے میں گونجی۔ ہم ہندی اور ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں کی عزت کرتے ہیں لیکن افسوس کہ کسی زبان کا کوئی نغمہ اتنی شہرت نہ حاصل کر سکا جو ساحر لدھیانوی کے قومی نغمے "وطن کی آبرو خطرے میں ہے تیار ہو جاؤ" اور جاں نثار اختر کے نغمے "آواز دو ہم ایک ہیں" کو حاصل ہوئی۔ یہ اردو زبان اور اس کے شاعروں ہی کی دین ہے۔

شاید کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ناگری رسم الخط میں ہی جو کچھ شائع ہو جائے وہی اردو ہے۔ کاش کہ اردو رسم الخط سے بیزار حضرات اسے بھی جاننے کی زحمت گوارا کرتے، اردو کا اصل روپ دیکھتے اور اندازہ کرتے کہ کس مپرسی کی حالت میں بھی اردو بڑی جاندار ہے۔ جب تک اردو کو اس کے اپنے رسم الخط میں پڑھنے کی زحمت نہیں کی جائے گی اس وقت تک اس کی موثر کیفیات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ہمیشہ ہی محسوس کیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر کشمیر کو نقصان پہنچا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کی سالمیت کو نقصان پہنچایا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جمہوریت کے مقدس چراغ کو ظلم و استبداد کی آندھی سے نہ بچا سکے۔ یہاں بڑے اور چھوٹے شاعروں کی تخصیص نہیں۔ سرزمین کشمیر کو اردو شعرا نے موضوع بنایا ہے۔ جتنی نظمیں اردو میں لکھی گئی ہیں اتنی شاید ہی کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہوں۔ اردو کی تمام تخلیقات کو ناگری رسم الخط میں شائع کرنا نہ تو آسان ہی ہے اور نہ ضروری۔

جب پاکستان نے ہندوستان کی جمہوریت کو چیلنج کیا، تو اس وقت اردو کا شاعر کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا۔ اخبارات اور رسائل میں لاتعداد نظمیں شائع ہو چکی ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ ہمارے شاعر بھی سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں دھرم یگ کا مضمون نگار کس طرح اردو کے بڑے شاعروں کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے محروم رہا۔ (اسے شکایت بڑے شاعروں ہی سے ہے) حالانکہ بڑے شاعروں کی نظمیں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو چکی ہیں۔ افسوس کہ وہ صرف کیفی کی نظمیں ہی پڑھ سکا یا سن سکا۔ کاش کہ وہ جان سکتا کہ محض کیفی کی آواز ہی نہیں گونجی ہے بلکہ دوسرے شاعروں کی آواز بھی اتنی ہی تیز ہے۔ ان کا انداز مخاطبت اتنا ہی موثر ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دھرم یگ کے مضمون نگار نے کن شاعروں کو بڑا سمجھا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مخدوم محی الدین، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور سلام مچھلی شہری کو بڑے شاعروں میں شمار نہیں کیا، ورنہ وہ یہ نہ لکھتا کہ اردو کے "بڑے ہندوستانی شاعروں نے بچ بچا کر کہا ہے"۔ کیا مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی کے ان مصرعوں میں بچ بچا کر کہنے کا سا انداز ہے ؎

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمین پاک اب ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

(مخدوم محی الدین)

ناپاک ارادوں نے بڑھ کر جس دیش کی دھرتی چھیڑی ہے
اس دیش کی دھرتی پر ہم نے نہرو کی راکھ بکھیری ہے
اس راکھ کی عزت رکھنے کو ہو جائیں گے سب قربان
یہ جان لے پاکستان
تاج اور اجنتا کے وارث اتہاس بنانے نکلے ہیں
کاشی اجمیر امرتسر کے سنگم کو بچانے نکلے ہیں
اس راہ میں جو بھی خون بہے تہذیب پہ ہے احسان
یہ جان لے پاکستان

کیا یہ آواز تیز نہیں ہے؟ افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو ادب برائے ادب یا تنقید برائے تنقید کی طرح تعصب برائے تعصب کے قائل ہیں۔

ہندوستان نے ہمیشہ ہی دنیا کو امن کا پیغام دیا ہے۔ اردو کے شاعروں نے بھی یہ سندیش دیا ہے۔ یہ احساس سردار جعفری کی شاندار نظم "دشمن کون ہے" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے ہمیشہ ہی پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ہم سب نے ہی محسوس کیا ہے کہ برصغیر کے ان دونوں ممالک کے مسائل ایک سے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے مل جل کر اپنے ملک کی تعمیر کریں۔ ایک دوسرے کے درد میں شریک ہوں۔ اردو کے شاعروں نے بھی ہندوستانی عوام کا یہ پیغام پاکستانی رہنماؤں کو دیا ہے۔ سردار جعفری نے بھی ایسا ہی سوچا اور کہا ہے لیکن جب شاعر کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے ؎

مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور

یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب
پھر آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

ادب سے آؤ کہ غالب کی سرزمین ہے یہ
نظام و چشتی و کاکی کے آشیانے ہیں
جھکا دو تیغ کہ سر بارگاہِ رحمت ہیں
ہمارے دل میں رفاقت بھی ہے اور پیار بھی ہے
تمہارے واسطے یہ دردِ بے قرار بھی ہے
اگرچہ کہنے کو جی چاہتا نہیں لیکن
جوابِ اہلِ ہوس تیغِ آبدار بھی ہے

جاں نثار اختر بھی سرزمین کشمیر کی حفاظت فرض سمجھتے ہیں ؎

مانگتا ہے آج ہم کو فیصلہ شمشیر سے
دور رکھنا ہے بھڑکتی آگ سے کشمیر کو
اس زمیں کے ہر گلِ تر کی حفاظت فرض ہے
یہ ہمارا گھر ہے اس گھر کی حفاظت فرض ہے

سلام مچھلی شہری نے غنائی نظمیں، خوب لکھی ہیں۔ انھوں نے طرح طرح کے تجربات کیے ہیں، جب بھی ایسا موقع آیا ہے کہ ہندستان کو اپنے تحفظ کے لیے، حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا پڑا ہے، سلام مچھلی شہری نے بھی دشمن کو للکارنا فرض سمجھا ہے جب چین کا حملہ ہوا، اس وقت سلام مچھلی شہری نے بڑی موثر نظمیں لکھی تھیں۔ آج بھی وہ ایک مجاہد نظر آتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "چشم و لب و رخسار" کے گیت گانے کا وقت نہیں ہے ؎

یقیناً کشورِ تخیل کا شہزادۂ دل ہوں
خبر ہے مہ جبینوں کو میں ہی جانِ محفل ہوں
مگر میں سرفروشانِ وطن میں آج شامل ہوں
کہ میرا سازِ آتش بار ابھی کچھ اور کہتا ہے!
کہو تو پھر خیال اور خواب کا فنکار بن جاؤں
وہی اک مطربِ چشم و لب و رخسار بن جاؤں
مگر میرے قلم کی ضد ہے اک تلوار بن جاؤں
وطن سے میرے دل کا پیار ابھی کچھ اور کہتا ہے!

غزل کے شاعر بھی ایسے موقعوں پر خاموش نہیں رہے بحیثیت شاعر ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہیں، ان سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے فن کا حسن اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ غزل میں ضرور نمایاں ہوتا ہے لیکن ایسے موقعوں پر وہ نظم نگاری کے کوچے میں بھی قدم رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں بڑے نظم نگار شعرا کی نظموں سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں۔ شفا گوالیاری خاص طور سے غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے رباعی و قطعات کا سہارا لے کر وہ سب کچھ صاف صاف الفاظ میں بھی کہہ دیا ہے جس کی غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی نظمیں اس احساس کی ترجمان ہیں کہ غزل کے شاعر کا لطیف لب و لہجہ اکثر شرارہ بھی بن جاتا ہے۔ ۸ر اکتوبر کے ہماری زبان میں شفا گوالیاری کی نظم "وطن اور شاعرِ وطن" شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم جدید سیاسی حالات پر لکھی گئی بہترین نظموں میں شامل کی جا سکتی ہے ؎

آندھیوں کی یورشیں ہیں برق کے طوفان ہیں
آبروئے گل وقارِ بوستاں خطرے میں ہے
خلدِ کشمیر و اجنتا جنتِ تاجِ حسیں ...
ہر نگارستانِ شہرِ دلبراں خطرے میں ہے
آہ تہذیب و تمدن علم و فن شعر و ادب ...
عظمتِ انسانیت کا ہر نشاں خطرے میں ہے
دیکھنا چھلکے نہ تم سے جامِ یکجہتی کہیں ......
میکشو ہشیار بزمِ میکشاں خطرے میں ہے
کیوں نہ ہم سینہ سپر ہوں کیوں نہ ہوں تیغ آزما
اے شفا جب گلشنِ امن و اماں خطرے میں ہے

افسوس کہ اردو کو متعصبانہ ذہنیتوں کا شکار محض اس بنا پر ہونا پڑتا ہے کہ دشمن ملک میں بھی یہ زبان پڑھی لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہاں کا اردو شاعر ہمارے وطن کے خلاف زہر اگلتا ہے اور ان حکمرانوں کی تائید کرتا ہے جن کی حکمت عملی تمام اختلافات کی بنیاد ہے۔ ہندستان کی اردو شاعری کی روایات، اردو شاعروں کے سیاسی شعور کا صحیح جائزہ لیے بغیر یہ الزام لگا دینا کہ انھوں نے موجودہ ہنگامی حالات میں تیز لب و لہجہ اختیار نہیں کیا، ایک مجرمانہ فعل ہے۔ جمہوریت کے علم بردار آزاد ہندستان کے اردو شاعروں نے حق و صداقت کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ جب بھی ہمارے ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہمارے شاعر خاموش نہیں رہے ہیں۔ ان کے قلم جو ہمیشہ امن کا پیغام دیتے رہے ہیں ایسے موقعوں پر تلوار بن گئے۔ وہ اپنے فرائض اور زبان و ادب کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ ہندستان کے اردو شعرا پر فرض ناشناسی کا الزام، غداری کے الزام کے مترادف ہے۔

مراسلات

خواجہ قمرالدین راقم کی شرح دیوان غالب

احوال غالب مرتبہ مختارالدین احمد (۱۹۵۳ء) میں راقم پر ایک مختصر مضمون ان کے پوتے مرزا رفیق بیگ کا شامل ہے۔ اس وقت اس مضمون کے صرف ایک حصہ کے متعلق چند لفظ کہنے ہیں۔ پوتے نے اپنے دادا کی تصانیف کے ذکر میں شرح دیوان غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کر کے حیدرآباد اپنے ساتھ لائے تھے نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے (جو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں) اتفاقاً ذکر آیا، وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دے دیجیے میں اس کو چھپواتا ہوں (کذا)۔ راقم نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور واپس چلے آئے۔ اس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خاں صاحب آثم نے جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بہ قدم تھے (افسوس کہ انھوں نے بھی ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غائب کہیں گم ہو گئی۔ اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ بہت گرد و غبار سے اب نکلا ہے لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ شائع کی جا سکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامہ اسداللہ خاں غالب دستیاب ہوا ہے، جو اسی شرح کا دیباچہ ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء"

اس اطلاع کے بعد میری نظر سے کبھی کوئی ایسا مضمون یا مراسلہ کہیں نہیں گذرا جس سے اس شرح دیوان غالب کے متعلق کوئی اور بات معلوم ہوتی، بالکل اتفاق ہے کہ چند دن پہلے ایک بزرگ نے بہ نیت ٹھیک اسی حالت میں جو خط کشیدہ الفاظ میں بیان کی گئی ہے، میرے حوالے کی۔ مجھے قطعی یقین ہے کہ یہ وہی اوراق ہیں جن کا ذکر مرزا رفیق بیگ نے کیا ہے۔ اس بہت ہی کٹے پھٹے کچھ صفحات، کرم خوردہ اور بوسیدہ حالت میں کسی طرح محفوظ رہ گئے ہیں۔ کاتب نے (جو یقیناً خود راقم ہیں) اشعار کے مطالب کاٹ کاٹ کر اور بدل بدل کر لکھے ہیں۔ دو چار جگہ ایک ہی بات دو صفحوں پر اس طرح ملتی ہے گویا پہلا مسودہ بہت خراب ہو گیا تھا، دوبارہ لکھا گیا ہے، رد کیے ہوئے صفحات بھی باقی رہ گئے ہیں۔ جہاں سے مسودہ شروع ہوتا ہے وہاں عنوان کی جگہ کشف الاشعار لکھا ہوا ہے غالباً راقم نے شرح کا یہی نام تجویز کیا تھا۔ فی الحال اتنا ہی لکھ سکتا ہوں۔ غور سے دیکھنے کے بعد اگر ضروری معلوم ہوا تو اور معلومات پیش کروں گا۔

ہاں ایک بات اور۔ انھیں صفحات کے ساتھ دو ورق یعنی چار صفحے ایک نثر کے بھی ہیں۔

یہ نثر راقم کی لکھی ہوئی کسی کہانی پر غالب کے شاگرد نواب سید احمد مرزا خاں دہلوی متخلص بہ آگاہ کی تقریظ ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہانی میں "نازنینوں کا ذکر" "شاہدان رنگین بیان کی تقریر" اور "انجمن راز و نیاز کی تصویر" ہے۔ آگاہ نے اسے "تذکرۂ گل رخاں" اور "دلچسپ مناظرۂ نسواں" بھی کہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راقم کی تصنیف عقد ثریا سے متعلق ہے جس کا ذکر مرزا رفیق بیگ نے اپنے مذکورہ مضمون میں کیا ہے۔ ان چار صفحوں میں ایک صفحہ پر آگاہ کی ایک نظم ہے جو راقم کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے۔ میری نظر سے عقد ثریا بھی نہیں گذری ہے، اس لیے اس کے متعلق بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

(پروفیسر سید احتشام حسین)

ایک استفسار کے جواب میں

"ہماری زبان" مورخہ یکم دسمبر پرسوں شام کو ملا ہے۔ مولانا دریابادی کا مراسلہ بعنوان "دو پتے مطلوب ہیں" نظر سے گذرا۔ رسالہ دارالعلوم کے متعلق میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں کیونکہ اس کے متعلق حالات کا مجھے علم نہیں۔ ہاں، پاپولر ڈکشنری کا ایک نسخہ میرے جد امجد مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا ہے۔ چوں کہ اس کا سرورق اور آخری کے کچھ صفحات غائب ہیں اس لیے میں یہ بتانے سے معذور ہوں کہ اس کا مصنف کون تھا۔ یہ ڈکشنری دو حصوں اور چار سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ہندوستانی سے انگریزی اور دوسرا انگریزی سے ہندوستانی پر مشتمل ہے۔ یہ رومن رسم خط میں ہے۔ پہلا حصہ دو سو گیارہ صفحات کا حامل ہے اور دوسرے حصہ میں بھی قریباً اتنے ہی صفحات ہوں گے۔ جا بجا تصویریں بھی ہیں جن سے اجسام و تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے پہلے حصہ میں تصویریں نہیں ہیں۔ چونکہ سرورق اور آخر کے صفحات غائب ہیں اس لیے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کب چھپی کہاں چھپی اور کیا قیمت ہے؟

مجھے امید ہے کہ مذکورہ معلومات مولانائے محترم کے لیے تشفی بخش ہوں گی۔ اگر وہ کچھ اور معلوم کرنا چاہیں تو ذیل کے پتے پر مراسلت کر سکتے ہیں۔

محمد عثمان اللہ قدیم
پتہ: موضع بھپورہ، ڈاکخانہ بھوانی پور براہ مجھوارہ ضلع دربھنگہ، بہار

مندرجہ معلومات درکار ہیں

۱۔ "محمد احتشام الدین دہلوی ایم۔ اے علیگ مصنف افسانہ پدمنی کا کیا پتہ ہے؟

۲۔ یہ بیتیں کس کی ہیں اور کس مرثیے میں ہیں؟

(الف) چار سو پھیلنے کی جا جو نہیں پاتی ہیں
بیلیں گھبرا کے درختوں پہ چڑھی جاتی ہیں

(ب) آیا کسی جگہ نہ خلل اعتقاد میں
پیچھے رہے نماز میں آگے جہاد میں

۳۔ ابو علی صاحب مطلع ہوں کہ مجھے محبوب کلیم کا پتہ نہیں ملا۔

جعفر حسن

کچھ سید علی اختر صاحب تلہری کے مراسلے کے سلسلے میں

ہماری زبان مورخہ یکم دسمبر ۱۹۶۵ء میں سید علی صاحب تلہری لکھنؤ کا ارشاد زیر نظر آیا:۔

"میری گذارش ہے کہ جناب خلش صاحب اس کی توضیح فرمادیں:"

میں نے فراق صاحب کے کسی شعر پر اظہار رائے کرتے وقت "کتب عروض کی شہادت ہے" کا جملہ استعمال کیا تھا جس پر سید اختر علی صاحب تلہری لکھنؤ کا ارشاد ہے کہ بدل البعض۔ بدل اشتمال اور بدل غلط علم نحو کی اصطلاحات ہیں نہ کہ کتب عروض کی جیسا کہ آغا خلش کاشمیری نے لکھ دیا ہے۔

میری گذارش یہ ہے کہ علم عروض شعر کے علم کا نام ہے۔ وزن شعر کی صحت اور شعر کا سقم یعنی عیب اسی علم سے جانا جاتا ہے۔ چونکہ شعر پر رائے زنی مقصود تھی اس لیے "کتب عروض" کا سہارا اصطلاحاً لیا گیا۔ شعر کی کسوٹی علم عروض ہی ہے۔

جہاں تک قواعد زبان اردو یا صرف و نحو کا علاقہ ہے میں یہاں تک بلکہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں ہنوز طالب علم ہوں اور اس ضمن میں مجھ سے بے شمار لغزشیں سرزد ہوسکتی ہیں۔

جہاں تک میرے کسی سے مرعوب نہ ہونے یا میرے غیر ادبی لہجے کا تعلق ہے وہ شاید عالی جناب سید اختر علی صاحب تلہری لکھنؤ کے بارے میں بھی قائم رہے اور میں اس گستاخی کی جرأت کرسکوں کہ سید صاحب عروض و نحو ہی نہیں صرف و نحو کے علوم میں بھی امتیاز کیا جاتا ہے جن کلمات کو آپ نے نحو کی اصطلاحات گردانا ہے وہ نحو کے علم سے متعلق نہیں ہیں۔ نحو علم املا یعنی رسم الخط کے علم کو کہا جاتا ہے (وہ علم جس سے کلام کے اعراب کا پتہ چلتا ہے) اشتا میں الفاظ کی ساخت و قطع و برید علم صرف سے منسوب ہے مجھے فراق صاحب سے خدانخواستہ نہ کوئی کد ہے نہ بیر۔ مسلکی شیخیاں بگھارنا" یا "خود فریب بڑ" کے جملے میں نے جان بوجھ کر لکھے تھے کہ کوئی خودساختہ اہل قلم پاؤں پھیلانے سے پہلے چادر کا جائزہ لینا نہ بھول جائے۔

(آغا خلش کاشمیری)

اہل دکن سے....

بمبئی یونیورسٹی کے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے اردو کورس میں ہر سال دکن کے کسی قدیم شاعر یا نثر نگار کی ایک یا دو کتابیں داخل ہوتی ہیں، کم و بیش یہی حال دوسری یونیورسٹیوں کا بھی ہوگا۔ ان کتابوں کو یونیورسٹی نصاب میں داخل کرنے کا مقصد یہ ہے اردو ادب کا طالب علم قدیم دکھنی اردو سے نابلد نہ رہے اس مقصد کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا' مگر قدیم دکھنی ادب کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں دو دقتیں سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ دکنی ادب کی قدیم مشہور کتابیں پوری تصحیح کے ساتھ نہیں چھپی ہیں دوسری یہ کہ ان کتابوں میں جو دکھنی الفاظ، محاورے، روزمرے اور ضرب الامثال استعمال کیے گئے ہیں ان کے معنی اور مفہوم مکمل طور پر نہیں دیئے گئے ہیں' نتیجہ یہ ہے کہ پڑھنے پڑھانے میں کئی دشواریاں سامنے آتی ہیں اور بہت سے مقامات پر اشعار اور سطروں کو سمجھے بغیر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے دکھنی ادب کی معروف کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شروع کیا تھا مگر ہم اسے مکمل اور آخری کوشش سمجھ کر خاموش ہو گئے ہیں مثلاً انھوں نے قطب مشتری نامی کتاب کو ۱۹۳۸ء میں مرتب کیا تھا، مثنوی کے آخر میں ۲۴ صفحات پر مشتمل ایک فرہنگ بھی شامل کردیا تھا مگر جب اس سال بی۔ اے کے نصاب کی حیثیت سے اسے پڑھنا اور پڑھانا پڑا تو محسوس ہوا کہ یہ فرہنگ کافی حد تک تشنہ ہے، بہت سے اہم الفاظ کے معنی نہیں دیئے گئے ہیں اور وجہی نے اس کتاب میں جہاں جہاں ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے، فرہنگ میں اس کی طرف بھی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق نے کام جس حد تک پہنچایا ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے آگے بڑھایا جائے تاکہ ان کتابوں کے پڑھنے اور پڑھانے میں اور بھی آسانیاں پیدا ہوں۔ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قدیم دکھنی ادب کی مشہور کتابوں کو از سر نو مرتب کیا جائے، اس سلسلہ میں ایک اور مفید اور اہم کام کرنے کا یہ ہے کہ قدیم دکھنی الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال پر مشتمل ایک جامع لغت تیار کیا جائے۔ یہ کام چونکہ دکن کے اہل ادب زیادہ آسانی سے کرسکتے ہیں اس لیے میں نے انہی سے خطاب کیا ہے

ڈاکٹر سید عبدالحی رضا
(سینٹ زیویرس کالج بمبئی)

شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو زبان و ادب کی تعلیم کے متعلق سیمنار

علی گڑھ ۲ جنوری۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو زبان و ادب کی تعلیم پر چار روزہ سیمنار (۳۰ دسمبر تا ۲ جنوری) کا انعقاد کیا گیا۔ ۳۰ دسمبر کو اس سیمنار کا افتتاح ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب نے کیا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت نواب علی یاور جنگ (وائس چانسلر) صاحب نے کی۔

مندوبین اور خواجہ غلام السیدین صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے کہا کہ میں سیدین صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس سیمنار کا افتتاح کرنا منظور کیا اور شعبہ کی دعوت پر تشریف لائے۔ سیدین صاحب ایک ماہر تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک اہم ادیب بھی ہیں اور علی گڑھ میں شعبۂ تعلیم سے وابستگی کے زمانے سے اردو کی تعلیم سے خصوصی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ آج پوری دنیا جس دور سے گذر رہی ہے اس میں ان قدروں کی حفاظت اور بقا خطرہ میں ہے جن کے بغیر انسانیت کے گمراہ ہو جانے کا امکان ہے۔ ادب کے ذریعے ہی ان اعلیٰ انسانی قدروں کو عام کیا جا سکتا ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ سے پیدا شدہ خالص مادی نقطۂ نظر کی تہذیب کی جا سکتی ہے جس کے بغیر انسان صحیح معنوں میں مہذب کہلانے کا مستحق نہیں۔ سرور صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے ان تمام کوتاہیوں اور خامیوں کا ذکر کیا جو اردو زبان و ادب کی تعلیم میں ایک زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب و زبان کی تعلیم کا مقصد صرف طلبا کو اس قابل بنانا نہیں ہے کہ وہ امتحانات پاس کر لیں بلکہ ان کی تمام ذہنی قوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب کرنا ہے تاکہ وہ زندگی سے صحیح اور سچی محبت کر سکیں۔ سرور صاحب نے آج کے ہندوستان میں علاقائی زبانوں کے ذریعہ تعلیم اور مادری زبان میں تعلیم کے صحیح نقطۂ نظر کی ضرورت کی طرف خصوصی طور سے توجہ دلائی۔

پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب نے اپنے افتتاحی خطبے میں سرور صاحب کی تقریر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں زبان و ادب کی تعلیم کے سلسلے میں اتنی توجہ نہیں کی جا رہی جتنی کہ آزاد ملک میں ہونی چاہیے اس کی وجہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اور ہمارا وہ رویہ ہے جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی قدر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج پوری دنیا اس طرف جا رہی ہے کیونکہ مادی ترقیوں کا انحصار ان کے فروغ و ارتقا سے وابستہ ہے لیکن یہ ترقی زبان و ادب کی ترقی کے بغیر نہیں ہوگی۔ انسان میں اعلیٰ انسانی قدروں سے محبت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسانی ذہن کے ہر گوشے کی ترقی ہو اور یہ کام زبان و ادب کی تعلیم کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے۔

شعبۂ اردو نے جس سیمنار کا انعقاد کیا ہے وہ بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ ہمارے یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کے جو طریقے اور جو نصاب رائج ہیں وہ کئی اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کا جائزہ جدید دور کی ضرورتوں کے لحاظ سے لیا جانا چاہیے۔ سیدین صاحب نے اس سلسلے میں بعض اہم مشورے دیے۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو زندہ اور اہم شعراء اور ادیبوں کو ایک لمبی مدت کے لیے اپنے یہاں مدعو کرے اور وہ شعبہ سے اس طرح وابستہ ہوں کہ طلبا ان سے مل کر ان سے تبادلۂ خیال کر کے اپنی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کی تربیت و تہذیب کریں۔ سیدین صاحب نے یہ بھی کہا کہ اساتذہ کے انتخاب کے سلسلے میں جو طریقے اور معیار رائج ہیں وہ کئی اعتبار سے نامعقول ہیں اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں سیدین صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سرور صاحب اور سیدین صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان سے پوری طرح متفق ہوں۔ علی گڑھ اور اردو کا ایک خصوصی تعلق ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اردو کو ہندوستان میں اس کا جائز مقام ملنا چاہیے۔ اردو زبان میں ادب کا جو قیمتی ادبی سرمایہ ہے وہ ملک کی بہت سی دوسری زبانوں سے زیادہ جاندار اور قابل قدر ہے اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی انکوائری کمیٹی نے جہاں اور بہت سے مشورے دئے تھے وہاں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے فروغ پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ لیکن یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اس مشورے کو عملی شکل دینے کی کوشش نہیں کی۔ میری خواہش ہے

کہ اس پر جلد سے جلد عمل شروع ہو۔

وائس چانسلر صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اردو زبان و ادب کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرتے وقت اردو زبان کے تحفظ کے مسئلے پر بھی غور کیا جائے گا میری تجویز ہے کہ اردو زبان کے مسئلے پر غور کرتے وقت اس کے رسم الخط پر بھی غور کیا جائے۔ اردو کا مسئلہ صرف یوپی یا شمالی ہند کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پورے ملک سے ہے۔ جدید ضرورتوں اور دشواریوں کے پیش نظر اس رسم الخط میں کچھ تبدیلیوں اور اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اردو زبان و ادب کی تعلیم میں جو نقائص ہیں ان کا تعلق صرف اردو سے نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے پورے نظام تعلیم کے نقائص کا نتیجہ ہے۔ مجھے اس ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا انتظار ہے جس کے سیدین صاحب بھی ایک ممبر ہیں۔

اساتذہ کے انتخابات کے سلسلے میں وائس چانسلر صاحب نے سیدین صاحب کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے یونیورسٹیوں میں جو دیواریں کھڑی کر لی ہیں کبھی کبھی ان سے باہر آنے کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ تعلیم سے فیض اٹھانے والوں کی عام حالت ناگفتہ بہ ہے۔

اس سیمینار کے نو اجلاس ہوئے اور اردو شعر و ادب، اور زبان کی تدریس کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اہم موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور بحث کی گئی۔

(۱) نظم کی تدریس کا مسئلہ (۲) نثر کی تدریس کا مسئلہ (۳) اردو کے ابتدائی نظریات پر بحث (۴) زبان و ادب کے مطالعہ میں لسانیات کا مقام (۵) تحقیق کے جدید میلانات (۶) مشرق اور مغرب کے تنقیدی اصول (۷) اردو ادب کی تاریخ اور اس کی تدریس کا مسئلہ (۸) اردو زبان کے جملوں کی ساخت اور ان کی ترکیب (۹) عملی تنقید اور اس کی تعلیم (۱۰) مختلف درجات کے لیے موزوں درسیات اور نصابی انتخابات کا مسئلہ (۱۱) ہندوستانی یونیورسٹیوں کے لیے ایک ماڈل نصاب۔

اس میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں سے آئے ہوئے ماہرین زبان اردو، مشاہیر اساتذہ اور بلند پایہ ادیبوں نے شرکت فرمائی۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

جناب ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین،
پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد)
پروفیسر عبد القادر سروری (کشمیر)، ڈاکٹر اختر اورینوی (پٹنہ)، پروفیسر ضیا احمد بدایونی (دہلی)، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)، ڈاکٹر دیوا نواس مصرا (گورکھپور)، ڈاکٹر غلام عمر خاں (عثمانیہ حیدرآباد)، ڈاکٹر محمد عقیل (الہ آباد)، جناب عبد اللہ ولی بخش قادری (جامعہ ملیہ)، جناب ملک زادہ منظور احمد (گورکھپور)، جناب عبد الرؤف (کلکتہ)، جناب رشید علی (میسور)، جناب مبارز الدین رفعت (میسور)، جناب آفاق احمد (بھوپال)، جناب محمد ذاکر (جامعہ ملیہ)، جناب حنیف نقوی (بھوپال)، جناب منت الرحمن خاں منت (ناگپور)، جناب معین الدین (جامعہ ملیہ)، جناب عبد القوی دسنوی (بھوپال)، جناب خواجہ محمد حامد (ناگپور)، جناب شیخ محمد صدیق (غازی پور)، جناب علی حسنین عابدی (الہ آباد)، جناب مطیع الرحمن (پٹنہ)، جناب اکبر حیدری (سری نگر)، جناب محمد علی زیدی (راجستھان)، جناب صدیق الرحمن قدوائی (دہلی)، جناب سید اسد اللہ کامل (کشمیر)، جناب ملک غلام محمد شوریدہ (کشمیر)، محترمہ زینت ساجدہ (عثمانیہ)، محترمہ شمیم نکہت (دہلی)، محترمہ میمونہ اشرف (پٹنہ)، محترمہ بلقیس منظر اللہ (کشمیر)

ان کے علاوہ علی گڑھ کے مندرجہ ذیل اساتذہ نے مقالے پڑھے یا بحث میں حصہ لیا۔

پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر معین احسن جذبی، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، جناب خواجہ مسعود علی ذوقی، جناب نسیم قریشی، جناب اسلوب احمد انصاری، جناب چودھری محمد نعیم، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر [illegible]، جناب نادر علی خاں، جناب اسلم رضوی، ڈاکٹر محمد یٰسین، جناب قیصر حسین زیدی، محترمہ عابدہ زیدی، ڈاکٹر کے سی بھاٹیہ۔

علمی جلسوں کے علاوہ ایک ادبی شام بھی منائی گئی جس میں جناب مسعود علی ذوقی صاحب نے [illegible] (اردو ترجمہ از مجنوں گورکھپوری) کے کچھ اقتباسات اور انیس کے ایک مرثیہ کے کچھ بند اور ڈاکٹر منیب الرحمن صاحب نے جولیس سیزر (اردو ترجمہ منیب الرحمن) کے کچھ حصے ڈرامائی انداز میں پڑھے نیز اشفاق محمد خاں ریسرچ اسکالر نے سراج، میر، اور غالب کی غزلیں ترنم سے سنائیں۔

(نامہ نگار)

انجمن تعمیر اردو کا ایک جلسہ

انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام اتوار ۱۲ دسمبر ۶۵ء کو دلی کے ادیبوں و شاعروں کے ادبی نمائندہ اجتماع میں جناب سجاد ظہیر صاحب کی ساٹھ سالہ سالگرہ پر مبارکباد پیش کی گئی۔ جناب میر مشتاق احمد صاحب نے صدارت کی۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار جنرل سکریٹری انجمن نے موصوف کا استقبال و خیر مقدم کیا۔ سید سجاد ظہیر صاحب نے اس موقع پر ایک بصیرت افروز تقریر میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز و ارتقاء پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ان تمام اہم ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور

رہنماؤں کا ذکر کیا جو اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ جلسے کے اختتام پر سجاد ظہیر صاحب اور غلام ربانی تاباں صاحب نے کلام سنایا۔

(گلزار دہلوی)

انجمن ترقی اردو کریم نگر کے زیر اہتمام جلسہ

کریم نگر: ۲۰ دسمبر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے بتاریخ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۵ء بوقت ۹ بجے شب، بمقام پریشد کمیٹی، بصدارت جناب مکند لال مصرا صدر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر، اجلاس عام منعقد ہوا۔

جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری معتمد انجمن ضلع نے ۱۱ اور ۱۲ دسمبر کو بمقام حیدرآباد، ریاستی انجمن کے منعقدہ آندھرا پردیش کے اردو کارکنوں کے اجتماع کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

جناب مکند لال مصرا نے اجلاس عام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آندھرا پردیش کے اردو کارکنوں کے اجتماع میں کافی اہم فیصلے کیے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں کریم نگر ضلع میں بھی اہم اقدامات کیے جائیں گے، بالخصوص اردو کے قانونی موقف کے حصول کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے ایک تفصیلی پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔ ۱۰ جنوری سے آخری یا فروری کے پہلے ہفتہ میں یوم اردو منایا جائے گا۔ گاؤں گاؤں میں جلسے منعقد کیے جائیں گے اور قراردادیں منظور کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ مختلف سیاسی، مذہبی، لسانی، پیشہ ورانہ، وکلاء، اساتذہ، طلبہ اور مزدوروں کی تنظیموں، ضلع پریشد، پنچایت سمیتیوں، بلدیات، گرام پنچایتوں اور اراکین اسمبلی و پارلیمنٹ سے ربط پیدا کیا جائے گا تاکہ اردو کے قانونی موقف کے لیے ان کی تائید حاصل کی جا سکے۔ اس لیے وہ اردو داں افراد جو ان شعبوں سے وابستہ ہوں، ان کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنی طرف سے اس تعلق سے کوشش کریں۔

ادبی مجلس:-

صدارتی تقریر کے بعد ادبی مجلس کے پروگرام کا آغاز ہوا۔

جناب عبدالقادر فاروقی ایڈوکیٹ، معتمد انجمن ترقی اردو شاخ جگتیال نے ادبی مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل آفاقی ادب سے ہی ممکن ہے۔ امن اور انسانیت کے جذبے کے فروغ کے لیے ادیبوں اور شاعروں کو رہنمائی کرنی پڑے گی، یہ کام سیاست داں نہیں کر سکتے۔ کسی ملک کی تاریخ، تہذیب اور عظمت کا اندازہ عمارات و مقامات سے نہیں ہوتا، بلکہ ادبی تحقیقات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے شاعروں کو مشورہ دیا کہ وہ غزل کے میدان کے علاوہ دوسری اصناف سخن کو بھی اپنائیں۔

جناب انجم، ابوالنصر ناصر علی صدیقی ناصر، صابر توکلی، شاہین، ایم۔ اے۔ مجید رفیق، ریاست علی صدیقی تاج، البسمل اللہ خاں بسمل، سید معین حسن تمکین، عبدالباسط باسط لقوی، افتخار علی انور اور فضل اللہ ثاقب نے اپنا کلام پیش کیا۔

جناب ریاست علی صدیقی تاج کریم نگری معتمد ادبی مجلس کے شکریہ کے ساتھ، اجلاس عام و ادبی مجلس کے پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

(ابوالمکارم غازی الدین)

مرزا عاشق لکھنوی کی وفات پر تعزیتی جلسہ

لکھنؤ اسکول کے آخری نمائندہ شاعر مرزا عاشق لکھنوی کی وفات پر خیرآباد کے شعراء اور ادب نوازوں کی طرف سے ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی منعقد ہوا۔

مرزا محمد ادیب عاشق مرحوم لکھنوی نے تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں ۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء کو بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور وفات پائی۔ موجودہ لکھنؤ کے بزرگ شاعر تھے جن کا ایک بہت بڑا حلقہ تلامذہ سیتاپور اور خیرآباد میں موجود ہے۔

اس تعزیتی جلسہ میں مرزا عاشق مرحوم کی شعری صلاحیتوں اور فنکارانہ عظمت کا اعتراف کیا گیا اور ان کے کلام کی اشاعت کے متعلق بھی غور و خوض کیا گیا جو منتشر طور پر محفوظ ہے۔

(نامہ نگار)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، مدیر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا